OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

تہذیب وثقافت سے متعلق مسائل کے بارے میں متجددانہ رجحانات کے نقد و تجزیے کا تحلیلی مطالعہ

An Analytical Study of the Critique and Analysis of Modern Trends Regarding Culture and Civilization

Muhammad Shahbaz

Doctoral Candidate Islamic Studies, University of Sargodha, Sargodha

Abdul Rahman

Doctoral Candidate, A. Lecturer in Islamic Studies, University of Gujrat

Dr. Ashfaq Ahmed

Assistant Professor of Islamic Studies, University of Sargodha, Bhakkar Campus

Abstract

In the above discussion we have presented two important issues related to civilization and culture in which the arguments of critics of modern trends and their analysis have been analyzed. According to Islam, it is not permissible for a Muslim woman to marry a free woman or a slave in the marriage of a polytheist. *Allāma Qurtubī* has quoted the consensus of the ummah that "a Muslim woman cannot marry any non-Muslim. It is the result of distance from the religion of understanding, ignorance of the style and methodology of the narrators, because the arguments of the non-believers in this issue are so strong that their denial is not correct The position of the critics on this issue is also in line with the understanding of the Imams and traditional scholars. Similarly, another important issue is whether human nature decides what is halāl and what is harām. To deduce that Nature should be considered as a permanent source of religion in the matter of condition and sanctity is not correct in any way. Is tantamount to inflicting, is obviously misunderstood. And this thing needs to be considered as a permanent source of religion of nature or to occupy the position of dissolution and prohibition of human beings. Even in this case, the position of the critics is correct that the

CC BY

decision of *halāl* and *harām* will be decided by the texts of Quran and Sunnah and not human nature will be considered as the source of religion in halal and haram.

Keywords: Ssubcontinent, culture, civilization, Modern trends, response

تمہید

نبی اکرم کی سیرتِ مبارکہ نے ملتِ اسلامیہ کی زندگی کے ہر پہلو کے لئے راہنمائی فراہم کی ہے۔ ان میں سے ایک پہلو ثقافتی اور تہذیبی بھی ہے۔ دنیا کی تمام تہذیبوں اور ثقافتوں کے مقابلے میں اسلام کی تہذیب وثقافت بالکل منفرد اور امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ اُصول وضوابط اور افکار و نظریات ہیں جو نبی اکرم ﷺ نے اپنے اُسوہ حسنہ کے ذریعے اُمتِ مسلمہ کو عطا فرمائے ہیں۔ ثقافت کی تمام ترجہات میں اُسوہ حسنہ سے ہمیں ایسی جامع راہنمائی میسر آتی ہے جس سے بیک وقت نظری، فکری اور عملی گوشوں کا احاطہ ہوتا ہے۔ ایسی جامعیت دنیا کی کسی دوسری تہذیب یا ثقافت میں موجود نہیں ہے۔ مغربی مفکرین اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں اپنے تمام تر تعصبات کے باوجود اسلام کی عظیم الشان تہذیب اور ثقافت کی نفی نہیں کر سکے۔ انہیں برملا اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں نے یورپ کو تہذیب کی شائستگی کی دولت ہی سے نہیں نوازا بلکہ شخصیت کی تعمیر و کردار کے لئے بنیادیں فراہم کیں، تاریکی میں ڈوبے ہوئے یورپ کو ثقافت کی روشنی سے ہمکنار کیا، جنگل کے قانون کی جگہ ابن آدم کو شرفِ انسانی کی توقیر واحترام کا شعور عطا کیا اور یوں اس کرہ ارضی پر ان مہذب معاشروں کے قیام کی راہ ہموار کی جو آج بھی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ دائرہ کار متعین فرمائے ہیں۔ تاکہ نسل انسانی کے لئے معاشرتی غیرت وحمیت کے ضابطے برقرار رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں خواتین اسلام کو غیر محرم مردوں سے بچنے، ان سے پردہ کرنے، اپنی آوازوں کو پست رکھنے کی تلقین کی ہے حتیٰ کہ دیور تک کو موت قرار دیا ہے، اور اسی طرح محرم کے بغیر سفر کرنے حتیٰ کہ سفر حج تک سے روک دیا ہے، کسی مرد کے ساتھ تنہائی اختیار کرنے پر بھی پابندی عائد کی ہے اور جو عورت ان پابندیوں پر عمل درآمد نہیں کرتی، اس کے لئے اسم کا لب ولہجہ انتہائی سخت و کرخت ہے۔ جیسا کہ خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلنے والی کو زانی کہا گیا ہے۔ اور اسی طرح مردوں کو خواتین کے ساتھ اختلاط سے منع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ مردوں کو بھی نگاہیں پست رکھنے، عورتوں کو بلا وجہ چھونے تک منع کیا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جناب رسول اللہ ﷺ عورتوں سے بیعت اسلام لیتے ہوئے بھی کسی عورت کے ہاتھ پر بیعت نہیں لیتے تھے بلکہ پردے کے پیچھے سے زبانی بیعت لیتے تھے[1] اور اسی طرح لوگوں کو دوسروں کے گھروں میں جھانکنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ جب اسلام مرد و خواتین کے حوالے سے اتنی سختی کرتا ہے تو مخلوط سوسائٹی کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔ جبکہ متجددانہ رجحانات کے حاملین اس بات کا راگ الاپتے ہیں کہ مخلوط سوسائٹی کے بغیر معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ان لوگوں کا موقف یہ ہے کہ مخلوط سوسائٹی کے نتیجے میں عفت وعصمت پر زد پڑتی ہو تو مردوں اور عورتوں کا ملنا جلنا جائز نہیں۔ ہم نے اپنے اس مضمون میں تہذیب وثقافت سے متعلق متجددانہ رجحان اور اس پر ہونے والے نقد و تجزیہ کا تحلیلی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مخلوط سوسائٹی سے متعلق متجددانہ رجحان اور اس کا نقد

پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ: میری قرآنی بصیرت کے مطابق مردوں اور عورتوں کا ملنا جلنا ناجائز نہیں، لیکن جس میل جول کے نتیجہ میں عفت وعصمت کی قدر پر زد پڑنے کا احتمال ہو، اس سے احتراز ضروری ہے۔[2] متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یہ موقف

چونکہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے کیونکہ مخلوط سوسائٹی سے خواہ کسی کی عفت و عصمت پر زد پڑے یا نہ پڑے، اسلام مخلوط سوسائٹی کی اجازت نہیں دیتی۔ لہذا علما محققین نے متجددانہ رجحانات کے حاملین کے اس موقف کو قرآن و سنت اور تعبیرات اسلام کے مخالف جانتے ہوئے اس پر نقد کیا۔ نقد کے دلائل ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد دین قاسمی لکھتے ہیں: حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات، مطلق اختلاط مردوزن کے خلاف ہیں قطع نظر اس کے کہ عفت و عصمت کی قدر پر زور پڑنے کا احتمال ہو یا نہ ہو، اختلاط ذکور واناث در اصل وہ ذریعہ ہیں جس کو اختیار کرنے کا نتیجہ عفت و عصمت کو معرض خطر میں ڈالنے کی صورت میں نکلتا ہے، اس لئے اسلام اس ذریعہ ہی کا سدباب کرتا ہے جس کا نتیجہ مبتلائے شر ہونے کی شکل میں برآمد ہوتا ہو، وہ ابتدائی اقدامات جو بظاہر کتنے ہی اچھے اور معصوم دکھائی دیں، اگر فسق و فجور میں ملوث کر دینے کا موجب بن جائیں، تو ایسے ابتدائی اقدامات کا سدباب، ازروئے شریعت لازم اور ناگزیر ہے "عورت کے لئے اس کی طبعی کمزوریوں کے باعث جو ماہواری، حمل، زچگی، نفاس اور رضاعت کے باعث اس پر عارض ہوتی ہیں، یہی بات قرین عقل وعدل ہے کہ اس کا میدان عمل گھر کی چار دیواری تک محدود ہو، تاکہ وہ اپنی زندگی کی ان ناگزیر تکالیف کو گھر کے پر سکون گوشہ عافیت میں بآسائش وسہولت انگیز کر سکے۔[3] امور خانہ داری، حقوق شوہر کی ادائیگی، بچوں کی پرورش و پرداخت اور ان کی جسمانی ذہنی اور فکری واخلاقی نشوونما جیسے فرائض کی بجا آوری کے لئے ازبس ضروری ہے کہ عورت بیرون خانہ کے تمام اندیشہ ہائے فکر سے دستکش ہو کر، کارگاہ خانہ میں، اپنی فطری ذمہ داریوں کو نبھائے۔ قرآن کریم نے "وَقَرۡنَ فِي بُيُوتِكُنَّ"[4] اے خواتین! اپنے گھروں میں تم وقار سے ٹکی رہو۔ کہہ کر خواتین کے دائرہ عمل کو گھر کی چار دیواری تک سمیٹ دیا ہے اور محرم اعزہ واقربا کے چھوٹے سے دائرے کو ممیز کر کے خواتین خانہ اور غیر محرم مردوں کے درمیان پردے کو حد فاصل کے طور پر قائم کیا ہے۔ یہ تصریحات عورت کے لزوم بیت کو واضح کر دیتیں ہیں تاہم ضرورتا ان کا گھر سے نکلنا ممنوع نہیں ہے، یہ بات قرآن سے ثابت ہے اور سنت نبویہ ﷺ سے بھی گھر سے باپردہ خروج کے بعد، وہ کسی ایسی جلس و محفل میں شریک نہیں ہو سکتی، جس میں اختلاط صنفین پایا جاتا ہو، اس بات کو جاننا اور سمجھنا بہت ضروری ہے کہ، جو دین اعضائے خاتون پر نصب ہونے والی آرائش و زیبائش تک کو ظاہر کرنے سے منع کرتا ہے، اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ان اعضا ہی کو بے نقاب کرنے کی اجازت دے گا، عقلا محال ہے اور جو دین، عورت کے زیورات تک کی آواز۔ اجانب کے کانوں تک نہیں پہنچنے دیتا، اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ مخلوط مجالس میں اپنے فن گلوکاری سے سامعین کو نوازنے کی اجازت دے گا، بدیہی البطلان امر ہے، شریعت محمدیہ میں حکم حجاب ونقاب کے بعد، اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ عام معاشرتی زندگی میں خواتین مخلوط مجالس میں شریک ہوا کرتی تھیں الا یہ کہ کوئی مجلس محرم اعزہ واقارب پر مشتمل ہو، یا جنگ کے خصوصی حالات میں ایسا ہو۔ عہد نبوی میں خواتین بعض نمازوں کی ادائیگی کے لئے اگرچہ مساجد میں حاضر ہو اکرتی تھیں مگر وہاں مردوں کی نشستیں، خواتین کی نشستوں سے یکسر الگ ہو اکرتی تھیں۔ کسی صف میں مرد وخواتین، مل جل کر شانہ بشانہ کھڑے نہیں ہوتے تھے[5]، بلکہ نزول حجاب سے قبل کا بھی کوئی واقعہ ایسا منقول نہیں ہے جس میں مردوں کی کسی صف میں خواتین یا خواتین کی کسی صف میں مردوں کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہو، اب ظاہر ہے کہ جو دین مسجد و معبد میں بھی خواتین وحضرات کی مخلوط سوسائٹی کا روادار نہیں ہے، وہ خانہ خدا سے باہر ایسی مجالس کا روادار کیونکر ہو سکتا ہے، اور حضرت رسالتماب ﷺ کے بابرکت اور پر سعادت دور میں بھی، مردوزن کی مخلوط اور مشترک معاشرت کو رواج نہیں دیا گیا، تو آج کے فسق و فجور کے دور میں، اختلاط ذکور کو اناث کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

مخلوط سوسائٹی سے متعلق بحث کا تجزیہ

مخلوط سوسائٹی ایک ایسی معاشرت ہے جس کی نفی پر اسلام اپنا نظام حیات مرتب کرتا ہے اور جو ہدایات بھی دیتا ہے یہ طے کرتے ہوئے دیتا ہے کہ اہل ایمان کے معاشرے میں مخلوط مجالس اور مشترک محافل کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔اس لئے وہ مخلوط معاشرت سے متعلقہ احکام وہدایات دیتا ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔[6] سوال یہ ہے کہ اس آیت میں مردوں کو مردوں سے اور عورتوں کو عورتوں سے مذاق کرنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن عورتوں کو مردوں کا مذاق اڑانے اور مردوں کو عورتوں کا مذاق اڑانے سے باز رکھنے کا ذکر تک نہیں ہے۔ کیا اس کو ایسا کرنے کی کھلی اجازت پر محمول کر لیا جائے؟ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اسلام ان ہدایات کو جاری کرنے سے پہلے ہی یہ طے کر چکا ہے کہ اسلامی معاشرے میں مخلوط مجالس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے وہ مخلوط معاشرت سے وابستہ احکام وہدایت دیتا ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ہدایت و تعلیم کا انداز ہی ایسا ہوتا ہے جو مخلوط معاشرت کی نفی پر احساس پذیر ہو۔ لہذا ہم اس معاملے میں دیانتدارانہ تجزیہ کی بنیاد پر اس مقام تک پہنچتے ہیں کہ دین اسلام کسی صورت بھی مخلوط سوسائٹی کو قبول نہیں کرتا۔ جو لوگ مخلوط سوسائٹی کے قائل وفاعل ہیں تہذیب مغرب کی سلگتی آگ کے انگارے ان کے لئے باعث نشان عبرت کافی ہیں۔ جو اسلام عورت کو کسی غیر آدمی سے اونچی آواز میں بات تک کرنے کی اجازت نہیں دیتا وہ اسلام مخلوط سوسائٹی کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔ فریقین کے منصفانہ تجزیہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مخلوط سوسائٹی کے حوالے سے متجددانہ رجحانات کے حاملین کا موقف درست نہیں ہے کیونکہ کتاب وسنت کے قطعی دلائل اس کی اجازت کسی صورت نہیں دیتے کہ مخلوط سوسائٹی سے اگر کسی کی عفت و عصمت پر زد پڑے تو درست نہیں وگرنہ مخلوط سوسائٹی درست ہے۔ جبکہ نبی اکرمؐ نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا: خبر دار کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ بیٹھے جب دو مرد اور عورت اکھٹے ہوتے ہیں تو ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔[7] اگر مرد اور عورت دو کی موجودگی میں تیسرا شیطان ہوتا ہے تو جب مرد وزن کی زیادہ تعداد کا اختلاط ہو گا تو اس مجلس میں کتنے شیطان اکھٹے ہوں گے؟ متجددانہ رجحانات کے حاملین کے فہم و فراست پر کوئی ذی شعور آدمی کف افسوس ملنے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے۔

خاتون کو نکاح پڑھانے کی اجازت کے حوالے سے متجددانہ رجحانات اور اس کا نقد

دین اسلام میں ہر اعتبار سے خواتین کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے اور انہیں وہ مقام و مرتبہ عطا کیا گیا ہے جس کی فی الواقع وہ مستحق ہیں۔ ان کو مردوں کے مقابلے میں کمتر اور گھٹیا قرار دینے کی بجائے (جیسا کہ اسلام سے قبل اور آج بھی بعض مذاہب میں سمجھا جاتا ہے) اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورتوں کے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں، اسی طرح قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ عورت کو بھی اس کے نیک اعمال کا وہی اجر ملے گا جو مرد کو ملتا ہے اور محض صنف نازک سے تعلق رکھنے کی بنا پر اس میں کمی نہیں ہو گی، ارشاد باری تعالی ہے۔ "جو کوئی بھی نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت، لیکن ایمان دار ہو تو ہم اسے یقینا نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح مرد و عورت کی تخلیق کے اعتبار سے دونوں میں کئی طرح کے فرق موجود ہیں، جس کی بنا پر عملی زندگی میں ان کا رول مختلف ہے، اسی قسم کے مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی خاتون شرعی نقطہ نظر سے ولی نکاح نہیں بن سکتی، یعنی نکاح میں ولی بننے کے لئے مرد ہونا ضروری ہے اور یہ شرط کوئی اختلافی نہیں، بلکہ اسے ملت اسلامیہ کے تمام اہل علم کی تائید حاصل ہے جس پر بے شمار دلائل موجود ہیں۔ مگر متجددانہ رجحانات کی حاملین شخصیات میں سے بعض کا موقف یہ ہے کہ خاتون مخلوط سوسائٹی میں مردوں کے شانہ بشانہ دیگر معاملات میں

شریک ہونے کے ساتھ ساتھ مردوں کا نکاح بھی پڑھا سکتی ہے۔ ان کے نزدیک نکاح اصل میں مرد و عورت کے درمیان علانیہ ایجاب و قبول کے ساتھ مستقل رفاقت کا عہد ہے۔ ایک لڑکا اور لڑکی اگر مجمع عام میں بیٹھ کر یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ آج سے ہم بیاہے گئے ہیں تو بس بیاہے گئے۔ اس سے زیادہ اسلام میں قانون کا تقاضا نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک بڑی پاکیزہ مجلس ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو خصوصی حیثیت دی گئی ہے۔ اس میں اس چیز کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ والدین شریک ہوں، اعزہ و اقربا شامل ہوں، دوست احباب بھی آ جائیں تو انھی میں سے کوئی بزرگ اس موقع پر تذکیر و نصیحت کی باتیں بھی کر دے۔ یہی عمل ہے جس کو نکاح پڑھانا کہتے ہیں۔ یہ جس کا جی چاہے پڑھالے۔ خاتون پڑھانا چاہتی ہے تو وہ پڑھالے، مرد پڑھانا چاہتا ہے تو وہ پڑھالے۔ اسلام نے اس کے لیے کسی چیز کا پابند نہیں کیا۔ یہ ایک مستحب اور اچھا عمل ہے۔ لیکن ہمارے ہاں نکاح پڑھانا اب ایسے ہی بن گیا ہے جیسے کوئی منتر کرنا ہوتا ہے۔[8] متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یہ موقف قرآن وسنت اور مسلمانوں کے اجماعی حکم کے خلاف ہونے کی بدولت علا محققین نے اس پر نقد کیا ہے۔ ناقدین کے مطابق عورتوں کے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں۔" اسی طرح قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ عورت کو بھی اس کے نیک اعمال کا وہی اجر ملے گا جو مرد کو ملتا ہے اور محض صنف نازک سے تعلق رکھنے کی بنا پر اس میں کمی نہیں ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'جو کوئی بھی نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت، لیکن صاحب ایمان ہو، تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح مرد و عورت کی تخلیق کے اعتبار سے دونوں میں کئی طرح کے فرق موجود ہیں۔ جس کی بنا پر عملی زندگی میں ان کا رول مختلف ہے اسی قسم کے مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی خاتون شرعی نقطہ نظر سے ولی نکاح نہیں بن سکتی، یعنی نکاح میں ولی بننے کے لئے مرد ہونا ضروری ہے۔ اور یہ شرط کوئی اختلافی نہیں، بلکہ اسے ملت اسلامیہ کے تمام اہل علم کی تائید حاصل ہے۔ امام ابن رشد اپنی کتاب بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں: واما النظر فی الصفات الموجبۃ للولایۃ والسالبۃ لھا، فانھم اتفقوا علی ان من شرط الولایۃ الاسلام والبلوغ والذکوریۃ[9] ولایت کو واجب یا سلب کرنے والی صفات کے سلسے میں علماء کا اتفاق ہے کہ ولایت کی صحت کے لئے تین شرطیں ہیں۔ مسلمان ہونا، بالغ ہونا، مذکر ہونا" اور اسی طرح المغنی میں ہے "الذکوریۃ شرط للولایۃ فی قول الجمیع"[10] ولایت کے لئے مرد ہو نا تمام علماء کے قول کے مطابق شرط ہے۔ فقہاء کی مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ عورت ولایت نکاح کی اہل نہیں اور یہ اہل علم کا متفقہ موقف ہے۔ یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ جو ولی نہ بن سکے وہ ولی کی وکالت (نیابت) بھی نہیں کر سکتا۔ امام ابن قدامہ لکھتے ہیں: "ومن لم یثبت لہ الولایۃ لم یصح تو کیلہ لان وکیلہ نائب عنہ وقائم مقامہ"[11] جس کے لئے ولایت ثابت نہ ہو، اسے وکیل بنانا صحیح نہیں۔ کیونکہ ولی کا وکیل اس کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے۔ نکاح کے لیے ولی کا ضروری ہونا کئی ایک ادلہ سے معلوم ہوتا ہے شریعت اسلامیہ میں عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اپنا نکاح خود کر لے یا کسی دوسری عورت کا نکاح کرے۔

> عن ابي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: لا تزوج المراة المراة ولاتزوج المراة نفسها: فان الزانية هي التى تزوج نفسها[12]
>
> جناب ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت عورت کی شادی نہ کرے اور نہ ہی عورت اپنی شادی خود کرے۔ جو عورت اپنی شادی خود کرتی ہے وہ زانیہ ہے۔

علامہ محمد بن اسماعیل الصنعانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: "فيه دليل على أن المرأة ليس لها ولاية في الإنكاح لنفسها ولا لغيرها فلاعبارة لها في النكاح إيجاباً ولا قبولاً فلا تزوج نفسها

بإذن الولي ولا غيره ولا تزوج غيرها بولاية ولا بوكالة ولا تقبل النكاح بولاية ولا وكالة وهوقول الجمهور۔"[13] اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کو اپنا یا کسی دوسری عورت کا نکاح کرانے کا اختیار نہیں ہے۔لہذا نکاح کے سلسلے میں ایجاب و قبول کے بارے میں عورت معتبر نہیں ہے ولی وغیرہ کی اجازت کے ساتھ اپنی شادی خود نہ کرے اور ہی کسی دوسری عورت کی شادی ولایت ووکالت کے ساتھ کرے اور عورت کی ولایت ووکالت کے ساتھ نکاح قبول نہیں کیا جائے گا۔اور یہی جمہور علماء محدثین رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔علامہ صنعانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ عورت ایجاب و قبول کے بارے میں معتبر ہے اور نہ ہی نکاح میں عورت کی ولایت اور وکالت کو قبول کیا گیا ہے۔حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے سیدہ عائشہ کی روایت بطور دلیل ذکر کی ہے "عن عائشة رضى الله عنها انها انكحت رجلا من بنى اخيها جارية من بنى اخيها فضربت بينهمابسترثم تكلمت حتى اذا لم يبق الاالنكاح امرت رجلا فانكح ، ثم قالت :ليس الى النساء النكاح"۔[14] سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ثابت ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی کے بیٹوں (بھتیجوں) میں سے ایک آدمی کے نکاح کا بندوبست کیا۔انھوں نے ان کے درمیان پردہ لگا دیا پھر بات کی۔یہاں تک کہ جب عقد کے علاوہ کوئی معاملہ باقی نہ رہا، تو انھوں نے ایک مرد کو حکم دیا اس نے نکاح کر دیا پھر فرمایا: نکاح کا قائم کرنا عورتوں کا کام نہیں ہے۔ابن ابی شیبہؒ اور عبد لرزاقؒ کے مطبوعہ نسخے میں ہے "فإن النساء لا ينكحن"[15] "عورتیں نکاح نہیں کرا سکتیں ہیں"۔حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں: سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نکاح کے انتظامات وغیرہ میں عورت اپنا کردار پردے کے اندر رہ کر ادا کر سکتی ہے۔لیکن نکاح پڑھانے کی اسے اجازت نہیں۔اس لیے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب عقد نکاح کا معاملہ ہوا تو مرد کے سپرد کر دیا۔جب سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جیسی پاکباز خاتون اُم المومنین یہ کام نہیں کر سکتیں تو عاصمہ جہانگیر جیسی خبیث النفس عورت کو اس کا اختیار کہاں ہے کہ وہ بدون ولی خود ولایت کا اختیار بھی لے اور نکاح بھی پڑھادے۔[16] اس مسئلہ کی مزید تائید سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اس قول سے بھی ہوتی ہے۔انھوں نے فرمایا: " لا تشهد المرأة يعني الخطبة ولا تنكح "[17] عورت خطبہ نہ دے اور نہ نکاح کرائے۔ابو حنیفہؒ کے استاد الاستاذ امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:" ليس العقد بيد ها النساء إنما العقد بيد الرجال "[18] عقد نکاح عورت کے ہاتھ میں نہیں عقد نکاح صرف مرد کے ہاتھ میں ہے۔قرآن مجید میں سورہ البقرۃ کی آیت 237 میں بھی اللہ تعالیٰ نے "الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ "[19] کہہ کر عقد نکاح مرد کے حق میں ذکر کیا ہے نیز شروع سے لے کر آج تک امت مسلمہ کا اجماع و تعامل بھی یہی ہے کہ نکاح کرانا مرد کا حق ہے۔مندرجہ بالا احادیث صحیحہ اور آئمہ محدثین کی توضیحات سے معلوم ہوا کہ عقد نکاح مرد کے اختیار میں ہے اور نکاح کا خطبہ پڑھنا جو کہ مسنون ہے اور ایجاب و قبول کرانا۔یہ مرد کا حق ہے عورت اس باب میں معتبر نہیں ہے۔

خاتون کو نکاح پڑھانے کی اجازت کے حوالے سے بحث کا تجزیہ

دلائل کے تجزیہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے ابکہ جب عورت نہ ولی بن سکتی ہے اور نہ ولی کی وکالت کر سکتی ہے تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ نکاح نہیں پڑھا سکتی۔کیونکہ نکاح میں دراصل ایجاب ہوتا ہے جو ولی یا اس کا وکیل ہی کر سکتا ہے اور عورت ان دونوں ولایت اور وکالت کی اہل نہیں۔چودہ صدیوں سے اہل اسلام اسی اجماعی ومتفقہ رائے کے مطابق عمل کرتے رہے ہیں اور ان کی یہ روایت مسلمہ حثییت رکھتی ہے کہ نکاح پڑھانے کا عمل مرد حضرات ہی سر انجام دیتے ہیں لیکن امت کے اس اجماعی موقف اور اجتماعی تعامل کے برعکس متجددانہ رجحانات کے حاملین کی رائے یہ ہے کہ عورت بھی نکاح پڑھانے کا استحقاق رکھتی ہے، چناچہ جناب جاوید احمد غامدی سے سوال کیا گیا کہ کیا عورت نکاح پڑھا سکتی ہے؟ تو غامدی صاحب

نے جواب دیا: جی ہاں بالکل پڑھا سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی کوئی دلیل انہوں نے پیش نہیں فرمائی۔ ہمارے خیال میں جناب جاوید احمد غامدی کو اس کے بارے میں شرعی دلائل کے حوالے سے جواب دینا چاہیے تھا جسے انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ جو اہل علم کے اسلوب سے بہر حال مطابقت نہیں رکھتا۔ لہذا ہماری تحقیق کے مطابق غامدی صاحب اور متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یہ موقف علماء اسلام، اسلاف امت اور مسلمانوں کے اجماعی موقف اور اجتماعی تعامل کے خلاف ہے تہذیب اسلا م اس کو کسی صورت قبول نہیں کرتی۔ یہ موقف نا قابل عمل اور نہ قابل قبول ہے۔

عورت کے لئے چہرے کے پردہ / اوڑھنی سے متعلق متجددانہ رجحان اور اس کا نقد

خواتین کے پردے کے متعلق دین اسلام کی تصریحات نہایت واضح ہیں جس پر کتاب وسنت سے بے شمار دلائل موجود ہیں۔ جس کا مقصد معاشرے میں خواتین کی عزتِ نفس کی حفاظت باوقار اور باحیاء معاشرے کا قیام وارتقاء ہے۔ جس کے لئے دین اسلام نے خواتین کو ستر وحجاب کے مہذب شرعی حکم عطاء کئے ہیں۔ اسلام دین عفت وعصمت ہے اور اس نے خواتین کی عزت وآبرو کے تحفظ کے لئے بطور خاص ہدایات دی ہیں۔ گھر میں اور گھر سے باہر محارم اور غیر محرم کے سامنے ایک مسلم خاتون کو کہاں تک اظہار زینت کی اجازت ہے۔ ان تمام امور کے بارے میں کتاب وسنت میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ اسلامی قانون معاشرت کی رو سے انتہائی قریبی اعزہ کے علاوہ ایک مسلمان خاتون کے لئے اخفاءزینت کی کم از کم حد یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں اور چہرے کے علاوہ پورا جسم مستور رہے، جب کہ متجددانہ رجحانات کے حاملین کی ایک جماعت سرے سے شرعی پردے کا انکار کرتی ہے اور اس کو شرعی حکم کی بجائے فقط تہذیبی روایت کا نام دیتی ہے۔ ان میں چند ایک کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

جاوید احمد غامدی

ان کے نزدیک چونکہ معاشرے میں خاتون خانہ کو ہر وہ حق ملنا چاہیے جو معاشرے میں مردوں کو حاصل ہیں اسی طرح ان کے مطابق عورت کے لئے دوپٹہ اوڑھنا مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں۔[20]

غلام احمد پرویز

ان کے موقف کے مطابق عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دینا جرم فحش کی سزا ہے، لہٰذا ہمارا مروجہ پردہ جس میں عورتوں کو گھروں کے اندر قید رکھا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف منشائے قرآنی کے خلاف ہے۔ بلکہ جرم ہے کیونکہ کسی بے گناہ کا حبس بیجا عرفاو شرعا جرم ہے۔[21]

عمر احمد عثمانی

ان کے نزدیک نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم مردوں کو اسی لئے تو دیا گیا ہے کہ غیر محرم عورتوں پر ان کی نگاہ نہ پڑے اگر عورتیں مستقل طور پر سارے بدن کو چھپا کر نکلیں کہ نہ ان کا چہرہ کھلا ہو، اور نہ ہاتھ پاؤں ہر طرح ڈھکی چھپی ہوں تو مردوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ وہ اپنی نگاہیں اوپر بھی رکھیں تو انہیں کیا نظر آ سکتا ہے۔[22] متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یہ موقف چونکہ قرآن وسنت اور مسلمانوں کے صریح نصوص کے خلاف ہے اس لئے علما محققین نے متجددانہ رجحانات کے حاملین کا محاکمہ کرتے ہوئے نقد کے دلائل ذکر کئے ہیں۔ ناقدین محققین کے مطابق اسلام دین عفت وعصمت ہے اور اس نے خواتین کی عزت وآبرو کے تحفظ کے لئے بطور خاص ہدایات دی ہیں۔ گھر میں اور گھر سے باہر محارم اور غیر محرم کے سامنے ایک مسلم خاتون کو کہاں تک اظہار زینت کی اجازت ہے۔ ان تمام امور کے بارے میں کتاب وسنت میں

واضح ہدایات موجود ہیں۔ اسلامی قانون معاشرت کی رو سے انتہائی قریبی اعزہ کے علاوہ ایک مسلمان خاتون کے لئے اخفاء زینت کی کم از کم حد یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں اور چہرے کے علاوہ پورا جسم مستور رہے۔ ظاہر ہے اس میں سر پر دوپٹہ اوڑھنا از خود شامل ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اس کے دلائل اس قدر واضح اور قطعی ہیں کہ تاریخ اسلامی کی چودہ صدیوں تک مسلمان اس مسئلہ میں کسی بھی اختلاف سے ناآشنا رہے اور اہل علم کے مابین اس پر کامل اتفاق رہا۔[23] متجددانہ رجحانات کے ناقدین کی طرف سے اپنے موقف پر مندرجہ ذیل دلائل ذکر کیے ہیں۔ چنانچہ اندلس کے مشہور فقیہہ اور محدث امام ابو محمد علی بن حزم الظاہری اپنی شرہ آفاق کتاب مراتب الاجماع میں لکھتے ہیں: ''واتفقوا علی ان شعر الحرۃ و جسمھا حاشا وجھھا ویدھا عورۃ"[24] اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آزاد عورت کے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ تمام جسم اور بال ستر ہیں ملت اسلامیہ کے اس متفقہ موقف کے برعکس ادارہ المورد کے سربراہ جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک دوپٹے کا مسئلہ سرے سے شرعی ہی نہیں ہے، چناچہ اس سوال کے جواب میں کہ "دوپٹے کا شرعی حکم کیا ہے؟ جناب غامدی صاحب فرماتے ہیں:"دوپٹہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے۔ اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے اس کا کوئی جواز نہیں۔ دوپٹہ کے شرعی حکم ہونے کے تفصیلی دلائل سے صرف نظر کرتے ہوئے ہماری گزارش صرف اتنی ہے کہ اس مسئلے پر اجماع ہے اور اجماع اسی مسئلے پر ہوتا ہے جو شرعی ہو، اصول فقہ کی مشہور و متداول کتاب الوجیز فی اصول الفقہ کے مصنف ڈاکٹر عبد الکریم زیدان نے علامہ آمدی کے حوالے سے اجماع کی درج ذیل تعریف نقل کی ہے "الاجماع ھو اتفاق المجتھدین من الامۃ الاسلامیۃ فی عصر من العصور علی حکم شرعی بعد وفاۃ النبی''[25] اجماع سے مراد نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کسی خاص دور میں امت اسلامیہ کے تمام مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر متفق ہو جانا ہے۔ "سید ابو الاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں: اس آیت (غض بصر۔ کا جو حکم مردوں کے لئے ہے) سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی عام اجازت تھی۔ تبھی تو غض بصر کا حکم دیا۔ ورنہ اگر چہرے کا پردہ رائج کیا گیا ہو تا تو نظر نچانے یا نہ بچانے کا کیا سوال؟ یہ استدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے۔ اور واقعہ کے اعتبار سے بھی، عقلی لحاظ سے یہ اس لئے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ رائج ہونے کے باوجود، ایسے مواقع اچانک آسکتے ہیں۔ جبکہ اچانک کسی مرد اور عورت کا آمنا سامنا ہو جائے، اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے پھر مسلمان عورتوں میں پردہ عام رائج ہو جانے کے باوجود۔ کہ وہ منہ کھولے۔ بہر حال غیر مسلم عورتیں تو بے پردہ ہی رہیں گی۔ لہذا محض غض بصر کا حکم اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مستلزم ہے۔ اور واقعے کے اعتبار سے یہ اس لئے غلط ہے کہ سورۃ احزاب میں احکام حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا تھا اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا۔[26] متجددانہ رجحانات کے نقد و تجزیہ علما محققین نے نہایت زبردست دلائل ذکر کئے ہیں انہیں دلائل میں علمائے اسلام کی وہ تصریحات ہیں جو ناقدین کے موقف کو مزید قوی بنادیتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

پردہ کے متعلق علمائے اسلام کی تصریحات

خواتین اسلام کی عزت وناموس کی حفاظت اور عفت و عصمت کے معیار کو معاشرے میں بلند رکھنے کے لئے قرآن وسنت میں دلائل ذکر کئے گئے ہیں، جن کی تصریحات آئمہ محدثین نے بیان کرتے ہوئے مسائل کی وضاحت فرمائی ہے اسی طرح پردہ کے متعلق بھی جو علما محققین اور آئمہ دین کی آرا ہیں ان میں سے چند اقوال ذکر رہے ہیں۔ محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ انہوں نے عبیدہ سلمانی سے اس آیت "یُدنِینَ عَلَیھِنَّ مِن جَلَابِیبِھِنَّ" 27 کے متعلق پوچھا: انہوں نے اپنی چادر اٹھائی اور پورا سر اور پیشانی اور پورا چہرہ ڈھانپ کر بائیں طرف والی آنکھ کو کھلا رکھا۔ ابن جریر اور ابو حیان نے ابن عباس سے روایت کی کہ

انہوں نے کہا کہ: عورت جلباب کو ماتھے کے اوپر سے موڑتے ہوئے باندھ دے، پھر اسے ناک کے اوپر سے لے جاتے ہوئے یوں بل دے کہ ان کی آنکھیں کھلی بھی رہیں تو سینے اور چہرے کا بڑا حصہ مستور رہے"۔28 سدی سے بھی ایسی ہی کیفیت حجاب مروی ہے وہ فرماتے ہیں: "عورت اپنی ایک آنکھ اور پیشانی کو نیز چہرے کی آنکھ کے علاوہ باقی حصے کو ڈھانپ کر رکھے۔29 ابو حیان نے فرمایا: تمام اندلس کے شہروں کی یہی عادت ہے کہ عورت کی آنکھ کے سوا کوئی حصہ جسم بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا "30۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں: عورتیں اپنی چادریں اوڑھیں جبکہ دیگر علماء نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے سروں کو ڈھانپ کر رکھیں تا کہ یہ معلوم ہو کہ وہ آزاد خواتین ہیں۔31 علامہ ابو بکر جصاص رقمطراز ہیں: اس آیت میں (کہ عورتیں چادروں سے اپنے اوپر پلو لٹکا لیا کریں) یہ دلیل ہے کہ نوجوان عورت اجنبی مردوں سے اپنے چہروں کو مستور رکھے وہ اس بات پر بھی مامور ہے کہ گھر سے نکلتے وقت ستر اور عفت مآبی کا اظہار کرے، تا مشکوک افراد ان سے غلط امید و طمع نہ کر پائیں" جلابیب جلباب کی جمع ہے اور یہ ایک ایسی چادر ہے جسے عورت اپنے پورے جسم پر لپیٹ لیتی ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں: " اللہ نے اہل ایمان کی عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی چادروں سے اپنے سر اور چہرے ماسوا ایک آنکھ کے ڈھانپے رکھیں تا کہ معلوم ہو کہ وہ آزاد خواتین ہیں (نہ کہ لونڈیاں ہیں جن سے منافقین چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں)32 متجددانہ رجحانات کے نقد پر علما محققین کے اقوال کے ساتھ عہد نبوی میں خواتین اسلام کا پردہ کو لازم پکڑنے اور چہرے کا پردے کرنے کے لئے کس طرح عمل پیرا ہوتی تھیں یہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

عہد نبویؐ میں خواتین اسلام کا پردہ

عہد نبوی میں عورت کے چہرے کا پردہ کسی قوم کی دیکھا دیکھی اختیار نہیں کیا گیا بلکہ عین نزول قرآن کے زمانے میں اسلامی معاشرے میں اسے نبی اکرم ﷺ کی براہ راست نگرانی میں رائج کیا گیا تھا، اور اس کی ابتدا خود آپؐ کے گھر سے ہوئی تھی۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے جو واقعہ افک سے تعلق رکھتا ہے، بڑی معتبر سندوں کے ساتھ کتب احادیث میں موجود ہے، وہ فرماتی ہیں۔ "جنگل سے واپس آکر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہیں پڑ کر سو گئی، صبح کو صفوان بن معطل وہاں سے گزرے، تو دور سے کسی کو پڑے دیکھ کر ادھر آ گئے "فعرفني حين راني قبل الحجاب فاستيقظت باسترجاعه حين عرفني فخمرت وجهي بجلبابي"[33] وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے کیونکہ نزول حکم حجاب سے قبل، وہ مجھے دیکھ چکے تھے، جب انہوں نے" انالله وانااليه راجعون "پڑھا تو ان کی آواز میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر رسول اللہ ﷺ سے درخواست دی حضورؐ نے پوچھا: "یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟ اس نے عرض کیا: عورت ہی کا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: عورت کا ہاتھ ہے تو کم از کم ناخن مہندی سے رنگ لئے ہوتے (تا کہ ہاتھ کا دست خاتون ہونا واضح ہو جاتا) حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ بھی نبی اکرمؐ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، اتنے میں حضرت ابن ام مکتوم آ گئے۔ نبی اکرمؐ نے دونوں سے فرمایا "احتجبا منه" "تم دونوں اس سے پردہ کرو" بیویوں نے عرض کیا یا رسول اللہ!" اليس هواعمى لا يبصرونا ولا يعرفنا "اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھتے ہیں نہ ہمیں پہچانتے ہیں" آپؐ نے فرمایا:' افعميا وان انتما لستما تبصرانه' کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انہیں نہیں دیکھتی؟" اسی واقعہ کی حضرت ام سلمہ تصریح کرتے ہوئی فرماتی ہیں "ذالک بعدان امربالحجاب "[34]۔ یہ واقعہ حکم حجاب کے بعد نازل ہوا ہے۔ حضرت عائشہ کی حجاب کی سخت پابندی کا جو عالم تھا وہ درج ذیل واقعہ سے ظاہر ہے۔ اسحاق تابعی نابینا تھے وہ خدمت میں حاضر ہوئے، تو عائشہ نے ان سے پردہ کیا۔ وہ بولے "مجھ سے کیا پردہ؟ میں تو آپ کو دیکھتا نہیں۔ فرمایا: تم مجھے نہیں دیکھتے میں تو تمہیں دیکھ سکتی ہوں[35]۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا:' احرام باندھنے والی عورت نہ نقاب اوڑھے اور نہ ہی دستانے پہنے

۔[36] احرام کی حالت میں عورت کو نقاب میں رخصت ورعایت عطا کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ غیر از حالت احرام میں نقاب کا استعمال ضروری ہے۔ ورنہ اگر نقاب کا کسی حالت میں بھی وجود نہ ہوتا، تو اسے محض ایک حالت میں ممنوع قرار دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ اس طرح حج کے موقع پر احرام میں پردے سے روکنا، بجائے خود عدم احرام کی صورت میں پردے اور نقاب پر دلالت کرتا ہے۔ حج میں اگرچہ نقاب کا استعمال اور ستر وجوہ ضروری نہیں ہے، تاہم بعض متقی اور پرہیز گار خواتین ، حالت احرام میں بھی اس کا اہتمام فرماتی تھیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہ کی اس روایت سے ظاہر ہے۔ حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالت احرام مکہ کو جارہے تھے۔ جب مسافر ہمارے پاس سے گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں۔ وہ عام حالت میں تو اس سے بھی زیادہ چہرے کے پردے کا خیال رکھتی ہوں گی۔[37]

عورت کے دوپٹہ اوڑھنے اور چہرے کے پردہ سے متعلق بحث کا تجزیہ

متجددانہ رجحانات کے حاملین پر علما محققین نے قرآن وسنت کی نصوص سے نقد کے قوی دلائل پیش کر کے ان کے متجددانہ موقف کا محاکمہ کیا اور یہ بات ثابت کی ہے کہ عہد نبوی اور زمانہ نزول قرآن کے یہ واقعات اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ چہرے کا پردہ خود نبی اکرمؐ کے زمانے میں قرآنی تعلیمات کے اتباع میں رائج ہو چکا تھا۔ خود آپؐ نے اپنی ازواج مطہرات کو نابینا افراد تک سے پردہ کرنےکی ہدایت فرمائی تھی۔ ہم دیانتدرانہ تجزیہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ متجددین کا مذکورہ بالا موقف درست نہیں بلکہ علماء امت اور سلف وخلف کی تصریحات کے خلاف ہے۔ جس کی چند مثالیں نمونہ کے طور پر پیش خدمت ہیں۔ مثلاً پرویز صاحب کا مندرجہ ذیل موقف انتہائی شرمناک ہے وہ لکھتے ہیں: برصغیر میں شرعی پردہ کے متعلق جو عام طور پر تصور پایا جاتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ عورتوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ انہیں کسی اہم ضرورت سے بھی سفر وغیرہ میں گھر سے باہر نکلنا پڑے۔ تو برقعہ اوڑھ کر منہ چھپا کر، نقاب ڈال کر نکلنا چاہیے، تاکہ غیر مردوں کی نگاہ ان کے چہرے پر اور ان کے بدن پر نہ پڑ سکے۔ ہمارے ارباب شریعت کا اصرار ہے کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر بند رہنا چاہیے۔ اور اگر انہیں (مصیبت کے مارے کہیں) گھر سے نکلنا پڑے تو وہ چلتا پھرتا خیمہ نظر آئے۔ عورتوں کو اس حیثیت سے رکھنے کے لئے انہیں کسی اتھارٹی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ کیا تھا کہ انہو ں نے اپنے احبار ورہبان (علماء مشائخ) کو خدا سے علاوہ ہی خدا بنا رکھا ہے "یہی صورت ہمارے ہاں متوارث چلی آرہی ہے ۔ پرویز صاحب پردے کو عجمی سازش قرار دیتے ہیں جبکہ عمر احمد عثمانی صاحب اسے غیروں کی نقالی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک " یہ شرعی پردہ درست نہیں، جو ہمارے ہاں دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی رائج کر لیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دوسری قومیں ہیں کونسی؟ جن کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے یہ نقاب وحجاب اختیار کر لیا ہے؟ جناب عثمانی صاحب کے یہ الفاظ مغرب کی عریاں تہذیب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہیں۔ جس طرح آج تہذیب مغرب کی بالاتری میں مسلمان سیاسی آزادی پالینے کے باوجود ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر ان کے طور طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح کل یورپ اسلامی آداب معاشرت کو اختیار کر رہا تھا۔ جیسا ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے "یورپ پر اسلام کے احسان" میں لکھا ہے اسلامی تہذیب نے حیات مغرب کے ہر پہلو پر اثر ڈالا۔ ان لوگوں کے لباس، طور طریقے، تعمیرات میں مشرقیت آگئی۔ عورتوں کا احترام بڑھ گیا اور انہوں نے حریص نگاہوں سے بچنے کے لئے نقاب اتار اوڑھ لئے۔[38] جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات نبی کریمؐ کی قائم فرمودہ عملی روایات، علماء سلف وخلف کی تصریحات اور مغربی معاشرت کے تجربات کے تلخ نتائج یہ سب کچھ چہرے کے پردہ کو امر حق ثابت کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود متجددانہ رجحانات کے حاملین زمین وآسمان کے اس فرق کو جو حدود ستر اور حدود حجاب میں پایا جاتا ہے۔ نظر انداز کرتے ہوئے یا اسے خلط ملط کا شکار بناتے ہوئے یہی رٹ لگائے جارہے ہیں۔ کہ چہرے کا پردہ اسلامی

شریعت میں کوئی ثابت شدہ امر نہیں ہے جبکہ ہماری تحقیق کے مطابق دلائل کی روشنی سے یہ بات ثابت ہے کہ پردہ کے حوالے سے قرآن وسنت کے دلائل علماء کرام کی آراء سلف وخلف کی تصریحات سے اسلام کا مذہبی حکم ہے۔ جس کے مقابلے کے تمام دلائل کمزور اور بے بنیاد ہونے کے ساتھ ساتھ صرف اور صرف تقلید مغرب کا منہ بولتا بین ثبوت ہیں۔

مسلم خاتون کا غیر مسلم مرد سے شادی کرنے سے متعلق متجددانہ رجحان اور اس کا نقد

دین اسلام عفت وعصمت کی حفاظت کا دین ہے، جس میں انسانی معاشرت کے لئے مکمل رہنمائی موجود ہے۔ اسلام نے مسلمان مرد وخواتین کے لئے خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے انسانی خواہشات کا مکمل پاس رکھتے ہوئے نکاح کو مشروع قرار دیا۔ جس کے لئے اسلام اپنے ماننے والوں کو پاکدامن زندگی بسر کرنے کے لئے نا صرف ہدایات ورہنمائی دیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ صاحب حیثیت کے لئے نکاح کرنے کو فرض قرار دیتا ہے۔ اور مسنون نکاح کے نا صرف احکام ومسائل بیان فرمائے ہیں بلکہ شادی کی حدود وقیود بھی متعین فرمائی ہیں۔ جیسا کہ مسلمان عورت آزاد ہو یا غلام، اسے مشرک کے نکاح میں دینا جائز نہیں، پھر مشرک خواہ بت پرست ہو یا یہودی یا عیسائی یا مجوسی یا دہریہ کسی بھی غیر مسلم سے مسلم عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ علامہ قرطبی نے اس بات پر امت کا اجماع نقل فرمایا ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے قانون نکاح کی رو سے ایک مسلم مرد کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے۔ جب کہ غامدی صاحب مسلم خاتون کو ہندو آدمی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیتے ہیں جو کہ سراسر دین اسلام کی صریح نصوص، آئمہ محدثین کے فہم سے دوری اور تعامل امت اجماعی موقف کے خلاف ایک متجددانہ رویہ ہے۔ متجددانہ رجحانات کے حاملین کے موقف کے مطابق کوئی بھی مسلم خاتون کسی غیر مسلم لڑکے سے بھی شادی کر سکتی ہے ان کا موقف یہ ہے کہ ایک مسلمان لڑکی کے غیر مسلم لڑکے سے شادی کرنے کا براہ راست ذکر سوائے مشرک مردوں کے قرآن مجید میں مثبت یا منفی کسی پہلو سے موجود نہیں ہے۔ یعنی اسلامی شریعت میں یہ واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا کہ ان کی شادی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ لہذا اس معاملے میں مسلمان علماء کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ ہماری رائے میں غیر مسلم سے شادی کرنا ممنوع یا حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ قرآن مجید کی واضح ممانعت نہ ہونے کی بنا پر ایسی شادی غیر پسندیدہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس معاملے میں بہر حال آخری فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے شادی کی جائے یا نہ؟[39] متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یہ موقف قرآن وسنت کی صریح نصوص اور علما محققین، محدثین کرام کی طرف سے کی گئی تعبیر اسلام کے بالکل منافی ہے، ناقدین نے اپنے اس موقف پر بے شمار دلائل ذکر کرتے ہوئے یہ اصولی اور اجماعی موقف اپنایا ہے کہ مسلمان مرد کے لیے کسی مجوسی، کیمونسٹ، بت پرست، وغیرہ عورت سے شادی کرنا حلال نہیں کیونکہ اللہ تعالی نے اس سے منع فرمایا ہے 'اللہ سبحانہ وتعالی کا فرمان ہے 'اور تم مشرکہ عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہیں لے آتیں اور مومن لونڈی مشرکہ آزاد عورت سے بہتر ہے اگرچہ تمہیں اچھی ہی لگے۔[40] مشرک عورت وہ ہے جو صفات باری تعالیٰ میں شرک کرتی ہو، بت پرست ہو چاہے وہ عرب میں سے ہو یا کسی اور قوم سے۔ اور مسلمان عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی غیر مسلم مرد سے شادی کرے۔ وہ کسی بھی یہودی، عیسائی یا کافر سے شادی نہیں کر سکتی ہے۔ جس کی دلیل اللہ تعالی کا فرمان ہے: اور مشرک مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو نہ دو۔ جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایمان والا غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے، گو مشرک تمہیں اچھا ہی لگے۔ یہ لوگ جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالی اپنے حکم سے جنت اور اپنی بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ وہ اپنی آیات لوگوں کے لیے بیان فرما رہا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں امام طبریؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "اور تم مشرک مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو نہ دو۔ جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور مومن غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھا ہی لگے۔[41] یعنی اللہ تعالی نے یہاں بیان کیا

ہے کہ: مومن عورتوں پر مشرک مردوں سے نکاح کرنا حرام کر دیا ہے چاہے وہ کسی بھی قسم کا مشرک ہو۔ اے مومنو! تم اپنی عورتوں کو ان کے نکاح میں نہ دو۔ یہ تم پر حرام ہے۔ ان کا نکاح کسی مومن غلام سے کرنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالی کی شریعت پر ایمان رکھتا ہو۔ تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم ان کا نکاح کسی آزاد مشرک مرد سے کرو چاہے وہ حسب ونسب اور شرف والا ہی کیوں نہ ہو اور تمہیں اس کا شرف اور قبیلہ اچھا لگے۔ قتادہ اور زھری سے اس کے بارے میں روایت ہے کہ " اور تم اپنی عورتوں کو مشرکوں کے نکاح میں نہ دو وہ کہتے ہیں " اپنے دین والے کے علاوہ کسی اور دین چاہے وہ یہودی ہو یا عیسائی اور اسی طرح مشرک سے اپنی عورتوں کا نکاح کرنا حلال نہیں "۔ مسلمان مرد کسی غیر مسلم عورت یعنی یہودیہ یا نصرانیہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور دین سے تعلق رکھنے والی عورت سے مسلمان شادی نہیں کر سکتا۔ اس کی دلیل اللہ تعالی کا مندرجہ ذیل فرمان ہے۔" ساری پاکیزہ چیزیں آج تمہارے لیے حلال کر دی گئیں ہیں اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے۔ اور پاکدامن مسلمان عورتیں اور جو لوگ تم سے پہلے کتاب دیے گئے ہیں ان کی پاکدامن عورتیں بھی حلال ہیں جب کہ تم ان کے مہر ادا کرو۔ اس طرح کہ ان سے باقاعدہ نکاح کرو۔ یہ نہیں کہ اعلانیہ زنا کرو یا پوشیدہ بدکاری کرو۔ امام طبریؒ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: اور تم سے پہلے جنہیں کتاب دی گئی ہے ان کی پاکدامن عورتیں یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے عرب اور باقی سب لوگو! جنہیں تم سے قبل کتاب دی گئی ہے اور وہ تورات اور انجیل پر عمل کرنے والے یہودی اور عیسائی ہیں ان کی آزاد اور پاکدامن عورتوں سے بھی نکاح کر سکتے ہو۔ جب تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو۔[42] یعنی جن مسلمان اور اہل کتاب پاکدامن عورتوں سے تم نکاح کرو اور انہیں ان کے مہر ادا کر دو۔ مسلمان عورت آزاد ہو یا غلام اسے مشرک کے نکاح میں دینا جائز نہیں۔ پھر مشرک خواہ بت پرست، یہودی، عیسائی، مجوسی یا دہریہ کسی بھی غیر مسلم سے مسلم عورت کا نکاح جائز نہیں۔ علامہ قرطبی نے اس بات پر امت کا اجماع نقل فرمایا ہے:

> مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ اسلام کی سربلندی کے خلاف ہے۔ جس طرح کسی بھی مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں۔ خواہ یہودی ہو یا عیسائی اسی طرح اگر کوئی کلمہ گو مسلمان بھی شرک کا مرتکب ہو تو اس سے کسی مسلمان موحدہ عورت کا نکاح جائز نہیں۔ کیونکہ مرد کے غالب ہونے کی وجہ سے اس موحدہ عورت کو شرک پر مجبور کیے جانے کا خطرہ ہے۔ مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔[43]

اس لیے صورت مسئولہ میں مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوا، دونوں کے مابین علیحدگی لازم ہے۔ کیونکہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوا۔ اس لیے شوہر کے طلاق دیے بغیر دوسری جگہ نکاح درست ہو گا۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے "وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ---- لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ"[44] اور مشرکہ عورتیں جب تک ایمان نہ لے آئیں، تو تم ان سے نکاح نہ کرو۔ ایماندار لونڈی مشرکہ آزاد عورت سے بہتر ہے، اگرچہ تم کو مشرکہ عورت ہی اچھی لگتی ہے، اور نہ ہی مشرک مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دو، جب تک وہ ایمان نہ لائیں، مومن غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ مشرک تم کو اچھا لگے، یہ لوگ تم کو جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے۔ وہ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

حافظ عبد السلام بھٹوی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:" وَلَا تُنْكِحُواالْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا" اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان عورت آزاد ہو یا غلام اسے مشرک کے نکاح میں دینا جائز نہیں۔ پھر مشرک خواہ بت پرست ہو یا یہودی یا عیسائی یا مجوسی یا دہریہ کسی بھی غیر مسلم سے مسلم عورت کا نکاح جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں سے نکاح حرام کرنے کے بعد

سورۃ مائدہ میں اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی۔ مگر مشرک مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دینے سے منع کرنے کے بعد کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں دی۔[45] قرطبی نے اس بات پر امت کا اجماع نقل فرمایا ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا (کیونکہ یہ اسلام کی سربلندی کے خلاف ہے)۔[46] جس طرح کسی بھی مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں، خواہ یہودی ہو یا عیسائی اسی طرح اگر کوئی کلمہ گو مسلمان بھی شرک کا مرتکب ہو، جیسا کہ اس حاشیے کے شروع میں شاہ عبد القادر نے وضاحت فرمائی ہے تو اس سے کسی مسلمان موحدہ (توحید پرست) عورت کا نکاح جائز نہیں۔ کیونکہ مرد کے غالب ہونے کی وجہ سے اس موحدہ عورت کو شرک پر مجبور کیے جانے کا خطرہ ہے۔ "وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ" یہ جملہ واضح دلیل ہے کہ عورت اپنا نکاح خود نہیں کر سکتی بلکہ اس کا ولی اس کا نکاح کر کے دے گا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے واضح الفاظ میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح سے منع فرمایا: صحیح بخاری میں امام بخاریؒ نے زیر تفسیر آیت اور مزید دو آیات اس کے علاوہ احادیث سے یہ مسئلہ ثابت فرمایا ہے۔[47] حافظ طاہر الاسلام لکھتے ہیں: غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن میں واضح طور مسلمان خاتون کی غیر مسلم سے شادی کی ممانعت کا ثبوت نہیں ملتا۔ اولا تو سوال یہ ہے کہ واضح سے کیا مراد ہے؟ اگر وضاحت الفاظ کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے تو وہ قرآن میں موجود ہے اور اس طرح کہ جب اہل کتاب کی خواتین کے لئے اس اجازت کا نہ ہونا آپ سے آپ معلوم ہو گیا، بصورت دیگر اس خصوصیت کا جواز ہی باقی نہیں رہتا جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔ ثانیا: حرمت کا واضح ذکر نہ ہونے سے جواز کیسے ثابت ہو گیا، اس کی دلیل ذکر نہیں کی گئی اور اہل علم کے ہاں مسلمہ قاعدہ ہے کہ "*الاصل فی البضعۃ التحریم*" (مناکحات میں اصل حرمت ہے) یعنی کسی سے تعلق زوجیت قائم کرنے کے لئے شریعت کی صریح اجازت کی ضرورت ہے، بصورت دیگر یہ جائز نہیں ہو گا۔ ثالثا: یہ کہنا کہ اس مسئلے میں مسلمان علماء کی آرا مختلف ہو سکتی ہیں، محض ایک فلسفیانہ احتمال ہے جو کسی بھی معاملے میں اٹھایا جا سکتا ہے، اس کے برعکس امر واقعہ میں اس مسئلے میں چودہ صدیوں سے آج تک مسلمان علماء کے ہاں کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا کہ مسلمان عورت کی غیر مسلم سے شادی نہیں ہو سکتی۔[48] موسوعۃ الاجماع میں "نکاح غیر المسلم للمسلمۃ" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ "الاجماع علی تحریم نکاح الکافر للمراءۃ المسلمۃ"[49] کافر کی مسلمان خاتون سے شادی کے حرام ہونے پر اجماع ہے معلوم ہوا کہ اہل علم کے ہاں غیر مسلم اور کافر کے الفاظ مترادف کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت حذیفہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب انہوں نے حضرت عمر فاروق کے زمانے میں ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تو حضرت عمرؓ نے انہیں اس عورت کو چھوڑ دینے کا حکم لکھا۔ جب حضرت حذیفہؓ نے اس کی وضاحت چاہی۔ تو فرمایا: "میں اسے حرام تو نہیں سمجھتا لیکن اس میں مومن عورتوں کے لئے ضرور نقصان ہے۔ اس لئے علیحدگی کا حکم دے رہا ہوں"۔[50] اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر حضرت عمرؓ اسے جائز سمجھتے تھے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باوجود مسلمان اور اہل کتاب کے درمیان ایک چیز مشترک ہے وہ اللہ تعالیٰ، بعض رسولوں، آخرت اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ شاید اسی اشتراک اور قربت کی وجہ سے یہ گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس لئے اگر صحیح اہل کتاب ہونے پاک دامن ہونے اور خود مسلم مرد کے صحیح مسلمان ہونے جیسی اہم شرائط پوری ہوں تو یہ نکاح جائز ہے۔ اور اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں یا کچھ اور خطرات ہوں تو پھر جیسے حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ کو منع کر دیا تھا آج بھی اس سے روکا جا سکتا ہے۔ بعض نے اہل کتاب سے نکاح کو کراہت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے اور بعض ائمہ نے اسے بالکل حرام بھی کہا ہے اور ان کی دلیل بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا یہ قول ہے: "*لا اعلم شرکا اعظم من ان یقول ربھا عیسیٰ*" [51] مولوی غلام رسول سعیدی کے مطابق: "اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یتیم کے ساتھ مخالطت کا جواز بیان فرمایا تھا۔ جس کا تقاضا یہ تھا کہ یتیم کے مال کے ساتھ اپنا مال مخلوط کرنا بھی جائز ہے اور یتیم لڑکے یا یتیم لڑکی کے ساتھ اپنا یا اپنی اولاد کا

نکاح کرنا بھی جائز ہے تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بعض مسائل بیان فرمائے کہ مشرک مردوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کا اور مشرک عورتوں کے ساتھ مسلمان مردوں کا نکاح جائز نہیں ہے۔ کیونکہ نکاح کی وجہ سے شوہر اور بیوی کے ساتھ جسمانی اور ذہنی قرب ہوتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے عقائد و نظریات اور افکار و خیالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ خدشہ ہے کہ مشرک شوہر کے عقائد سے بھی ہو سکتا تھا کہ مسلمان بیوی متاثر ہو یا مشرک عورت کے نظریات سے مسلمان شوہر متاثر ہو۔ اس لیے اسلام نے یہ راستہ ہی بند کر دیا۔ اگرچہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مسلمان شوہر یا بیوی سے مشرک بیوی یا شوہر متاثر ہو جائے۔ لیکن جب کوئی چیز نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہو تو نقصان سے بچنے کو نفع کے حصول پر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس لیے اسلام نے مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان مناکحت کا معاملہ کلیۃً منقطع کر دیا۔ یہاں شرک سے مراد کفر ہے۔ اس لیے ملحد، مجوسی، بت پرست اور کسی قسم کے بھی کافر سے نکاح جائز نہیں ہے مسلمان مرد کا نہ مسلمان کا عورت کا۔ حافظ جلال الدین سیوطی اس آیت کے شان نزول متعلق لکھتے ہیں:

> امام ابن ابی حاتم اور امام ابن المنذر نے مقاتل بن حیان سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو مرثد غنوی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انہوں آپؐ سے اجازت طلب کی کہ وہ عناق نامی ایک مشرکہ عورت سے نکاح کر لیں جو نہایت حسین و جمیل عورت تھی اور حضرت ابو مرثد مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! وہ عورت مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: "اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔[52]

مسلم خاتون کا غیر مسلم مرد سے شادی کرنے سے متعلق بحث کا تجزیہ

مسلمان عورت آزاد ہو یا غلام اسے مشرک کے نکاح میں دینا جائز نہیں۔ پھر مشرک خواہ بت پرست ہو یا یہودی یا عیسائی یا مجوسی یا دہریہ کسی بھی غیر مسلم سے مسلم عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ علامہ قرطبی نے اس بات پر امت کا اجماع نقل فرمایا ہے کہ "مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا۔[53]" اسلام کے قانون نکاح کی رو سے ایک مسلم مرد کے لئے اہل کتاب عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے۔ جیسا کی قرآن مجید میں ہے:"وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ --- مِنَ الْخَاسِرِين "[54]اور پاک دامن عورتیں! ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی (تمہارے لئے حلال ہیں)' ظاہر ہے کہ یہ اجازت صرف مسلم مردوں کے ساتھ خاص ہے علاوہ ازیں مسلمان مردوں اور عورتوں کو مشرکین سے نکاح کرنے سے روک دیا گیا ہے ارشاد باری تعالی ہے:" وَلَا تَنكِحُواالْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ "[55]تم مشرک عورتوں سے ہر گز نکاح نہ کرنا، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی آزاد مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح آزاد مشرک مردوں سے نہ کرو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام آزاد مشرک مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔" ان دو آیات سے معلوم ہوا کہ مسلمان مرد مسلمان عورت کے علاوہ اہل کتاب کی عورت سے بھی شادی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی خاتون سے شادی کرنا اس کے لئے جائز نہیں۔ مسلمان خواتین اہل کتاب کے مردوں سے شادی نہیں کر سکتیں، ورنہ صرف اہل کتاب خواتین کے حلال ہونے کا ذکر بے معنیٰ ہو گا۔ مسلمان مردوزن کے لئے مشرکین سے نکاح کرنا ممنوع ہے۔ لہذا متجددانہ رجحانات کے حاملین کا موقف خواتین اسلام کو کسی غیر مسلم سے شادی کرنے کا اختیار دینا کسی صورت درست نہیں۔ یہ سراسر فہم دین سے دوری، محدثین کے اسلوب و منہج سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیوں ناقدین کے دلائل اس قدر مضبوط ہیں کہ ان کا انکار کسی صورت درست نہیں ہے۔

کیا حلال و حرام کا فیصلہ انسانی فطرت کرتی ہے؟ متجد دانہ رجحان اور اس کا نقد

اللہ تعالیٰ نے آدمی کی ساخت اور تراش شروع سے ایسی رکھی ہے کہ اگر وہ حق کو سمجھنا اور قبول کرنا چاہے تو بدء فطرت سے اپنی اجمالی معرفت کی ایک چمک اس کے دل میں بطور تخم ہدایت کے ڈال دی ہے کہ اگر گردوپیش کے احوال اور ماحول کے خراب اثرات سے متاثر نہ ہو اور اصلی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً دین حق کو اختیار کرے۔ کسی دوسری طرف متوجہ نہ ہو۔ جبکہ متجددانہ رجحانات کے حاملین میں سے بعض لوگ وحی کی تصویب سے بے نیاز ہو کر فطرت کو ایک الگ اور مستقل بالذات ماخذ دین قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ جس طرح شریعت کی رو سے بعض اشیاء حرام ہیں۔ اسی طرح بعض چیزوں کو انسانی فطرت بھی حرام قرار دیتی ہے۔ اس چیز کو وہ "بیان فطرت" کا نام دیتے ہیں جو در اصل فطرت انسانی کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ گویا ان کے ہاں اشیاء کی حلت و حرمت کے دو دائرے ہیں۔ ایک دائرہ شریعت کا ہے اور دوسرا انسان کی فطرت کا۔ اور یہ دونوں دائرے اپنی الگ الگ حیثیت سے چیزوں کی حلت و حرمت کا تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ غامدی صاحب اپنی کتاب میزان میں لکھتے ہیں:

> انسان کی فطرت اس معاملے میں بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کرلیتا ہے کہ کیا چیز طیب ہے اور کیا خبیث ہے، وہ ہمیشہ جانتا ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت نہیں، سواری کے لئے پیدا کئے گئے۔[56]

غامدی صاحب نے اپنے موقف کی حمایت میں مندرجہ ذیل علمائے کرام کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں۔ ان علمائے کرام کی تصریحات کو غامدی صاحب نے اپنے موقف کی دلیل بنایا ہے، مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر اور بھلے برے کی پہچان کے لیے ایک استعداد اور مادہ خود اس کے وجود میں رکھ دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: 'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا' یعنی نفس انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے فجور اور تقویٰ، دونوں کے مادے رکھ دیے ہیں۔[57] مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرتاً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقاء سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے۔ جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔[58]

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے آدمی کی ساخت اور تراش شروع سے ایسی رکھی ہے کہ اگر وہ حق کو سمجھنا اور قبول کرنا چاہے تو کر سکے اور بدء فطرت سے اپنی اجمالی معرفت کی ایک چمک اس کے دل میں بطور تخم ہدایت کے ڈال دی ہے کہ اگر گردوپیش کے احوال اور ماحول کے خراب اثرات سے متاثر نہ ہو اور اصلی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً دین حق کو اختیار کرے۔ کسی دوسری طرف متوجہ نہ ہو۔ "عہد الست" کے قصہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور احادیث صحیحہ میں تصریح ہے کہ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے اس کے بعد ماں باپ اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو "حُنفاء" پیدا کیا۔ پھر شیاطین نے اغوا کر کے انھیں سیدھے راستہ سے بھٹکا دیا۔ بہر حال دین حق، دین حنیف اور دین قیم وہ ہے کہ اگر انسان کو اس کی فطرت پر مخلی بالطبع چھوڑ دیا جائے تو اپنی طبیعت سے اسی کی طرف جھکے۔ تمام انسانوں کی فطرت اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی بنائی ہے جس میں کوئی تفاوت اور تبدیلی نہیں۔ فرض کرو اگر فرعون یا ابو جہل کی اصلی فطرت میں یہ استعداد

اور صلاحیت نہ ہوتی تو ان کو قبول حق کا مکلف بنانا صحیح نہ ہوتا۔ جیسے اینٹ پتھر یا جانوروں کو شرائع کا مکلف نہیں بنایا۔ فطرت انسانی کی اسی یکسانیت کا یہ اثر ہے کہ دین کے بہت سے اصول مہمہ کو کسی نہ کسی رنگ میں تقریباً سب انسان تسلیم کرتے ہیں۔ گو ان پر ٹھیک ٹھیک قائم نہیں رہتے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: یعنی اللہ سب کا مالک حاکم، سب سے نرالا، کوئی اس کے برابر نہیں، کسی کا زور اس پر نہیں، یہ باتیں سب جانتے ہیں۔ اس پر چلنا چاہیے۔ ایسے ہی کسی کے جان ومال کو ستانا، ناموس میں عیب لگانا ہر کوئی برا جانتا ہے۔ ایسے ہی اللہ کو یاد کرنا، غریب پر ترس کھانا، حق پورا دینا، دغا نہ کرنا، ہر کوئی اچھا جانتا ہے۔ اس راستہ پر چلنا وہ ہی دین سچا ہے۔ یہ امور فطری تھے مگر ان کا بندوبست پیغمبروں کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے سکھلا دیا۔ 59

مولانا امین احسن اصلاحی

ان کے موقف کے مطابق بدی کا بدی ہونا اور نیکی کا محبوب ہونا اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرما دیا ہے۔ انسان اگر بدی کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدی کے شعور سے محروم ہے، بلکہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بدی کو بدی جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرتا ہے۔[60] علما محققین نے متجددانہ رجحانات کے حاملین کے اس موقف کو مسلمانوں کے اجماعی موقف کے خلاف قرار دیتے ہوئے اس پر نقد کیا ہے جیسا کہ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر لکھتے ہیں: نفس انسانی میں ایک فطری رجحان کے پائے جانے کی حد تک اس بات سے اتفاق ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے: اسلام کے دین فطرت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے بندوں کو جس فعل کے بھی کرنے کا حکم دیا ہے۔ فطرت سلیمہ اس فعل کے کرنے کی طرف ایک فطری رجحان اپنے اندر محسوس کرتی ہے اور جس فعل کے کرنے سے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ہمیں روک دیا ہے۔ فطرت سلیمہ بھی اس فعل سے ابا محسوس کرتی ہے۔ احکام الٰہی فطرت انسانی کے مطابق تو ہیں لیکن فطرت انسانی سے ان کا تعین نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے جب سے آدم کو اس دنیا میں بھیجا ہے اس دن سے ہی اس کی رہنمائی کے لیے وحی کا سلسلہ جاری فرما دیا ہے۔ اس انتہائی اہم موقع پر جب کہ حضرت آدم کو اور ان کی آنے والی ذریت کو جنت سے اتار کر اس دنیا میں بھیجا جارہا ہے تو اس وقت انھیں صرف ایک ہی چیز کی پیروی کرنے کی تلقین کی جارہی ہے اور وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت ہے۔ اور دونوں جگہ قرآن کے الفاظ "منی ھدی" اور اس کا سیاق وسباق بتلاتا ہے کہ اس ہدایت سے مراد کوئی فطری ہدایت نہیں، بلکہ اللہ کی آیات اور اس کی طرف سے نازل کردہ وحی کی رہنمائی مراد ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ پہلے ہی دن سے اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے حضرت آدم اور ان کی آنے والی ذریت کو جو رہنمائی دی جارہی ہے وہ وحی کی رہنمائی ہے اور جس نے بھی اللہ کی دی ہوئی اس وحی کی رہنمائی سے استفادہ کرنے سے انکار کیا تو وہی لوگ اللہ کے عذاب کے مستحق ہیں۔ فاضل ناقد کا خیال ہے کہ غامدی صاحب وحی کی تصویب سے بے نیاز ہو کر فطرت کو ایک الگ اور مستقل بالذات ماخذ دین قرار دیتے ہیں۔ جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن مجید نے ایک مخصوص دائرے میں جانوروں سے متعلق صرف چار چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، اور ان کے علاوہ باقی تمام چیزوں کی حلت وحرمت کا فیصلہ فطرت انسانی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ فطرت کو حلت وحرمت کے باب میں مستقل بالذات ماخذ دین قرار دیا جارہا ہے، کسی طرح درست نہیں ہے۔ یہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کے اختیار کا نہیں، بلکہ حلال وحرام کے باب میں شریعت کے بیان کردہ اصول یعنی طیبات اور خبائث کے مصداق کی تعیین کا مسئلہ ہے اور جمہور فقہانے اس باب میں حلال اور حرام جانوروں کی فہرست تیار کرنے میں نصوص کے علاوہ انسانی فطرت سے بھی پوری پوری رہنمائی لی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ فطری علم کی روشنی میں طیبات وخبائث کی تعیین، تحلیل وتحریم کے زمرے میں آتی ہے اور یہ بات انسان کو شارع کے منصب پر فائز کرنے کے مترادف ہے، بدیہی طور پر سوء فہم ہے۔ یہ چیز اگر فطرت کے مستقل ماخذ دین قرار پانے یا انسان کے تحلیل وتحریم کے منصب پر فائز ہونے کو مستلزم ہے تو اس جرم میں جمہور

فقہاء بھی غامدی صاحب کے ساتھ پوری طرح شریک ہیں۔ جس طرح غامدی صاحب کا اصول فطرت غلط ہے، اسی طرح بعض مقامات پر اس اصول کی تطبیق میں انھوں نے اپنے ہی وضع کردہ اس اصول سے انحراف بھی کیا ہے۔[61] ان میں سے ایک کو ہم قارئین کے لیے بطور مثال بیان کیے دیتے ہیں۔ مَردوں کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں ڈاڑھی بھی شامل ہے۔ کسی چیز کی فطرت سے مراد اس کی وہ اصل تخلیق ہے جس پر اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے جس حالت پر پیدا کیا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ ان کے چہرے پر ڈاڑھی کے بال ہوتے ہیں جبکہ عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں یہ ہے کہ ان کے چہرے پر بال نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کی تخلیق میں یہ فطری فرق رکھا ہے۔ ڈاڑھی غامدی صاحب کے اصول فطرت سے ثابت ہے۔ لیکن غامدی صاحب نے اپنی ہی فطرت اور اپنے ہی اصول فطرت دونوں کی مخالفت اختیار کرتے ہوئے ڈاڑھی کو دین سے خارج قرار دیا ہے۔ علامہ محمود آلوسی نے بیان کیا ہے: *ویحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث: فسر الاول بالاشیاء التی یستطیبہا الطبع کالشحوم، والثانی بالاشیاء التی یستخبثہا کالدم، فتکون الآیۃ دالۃ علی ان الاصل فی کل ما تستطیبہ النفس ویستلذہ الطبع الحل وفی کل ما تستخبثہ النفس ویکرھہ الطبع الحرمۃ الا لدلیل منفصل" ویحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث*۔[62] پہلی چیز یعنی طیبات کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو طبیعت کو پاکیزہ لگیں جیسے چربی۔ اور دوسری چیز یعنی خبائث سے مراد وہ اشیاء ہیں جو طبیعت کو ناپاک لگیں جیسے خون۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو نفس کو پاکیزہ لگے اور طبیعت کو لذت دے، وہ حلال ہے اور ہر وہ چیز جو نفس کو ناپاک لگے اور طبیعت اس کو ناپسند کرے وہ حرام ہے سوائے اس کے کہ الگ سے کوئی دلیل ہو۔ صاحب "معارف القرآن" مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں: لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابل نفرت چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے آیت کے اس جملہ نے یہ بتلا دیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لیے حلال کی گئیں۔ جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں۔ اب یہ بات کہ کون سی چیزیں طیبات یعنی صاف ستھری مفید اور مرغوب ہیں اور کون سی خبائث یعنی گندی مضر اور قابل نفرت ہیں۔ اس کا اصل فیصلہ طبائع سلیمہ کی رغبت و نفرت پر ہے۔[63] "صاحب "تفہیم القرآن" نے لکھا ہے کہ ہر چیز طیب ہے اور حلال ہے سوائے ان چیزوں کے جنہیں شریعت نے ناپاک اور حرام قرار دیا ہے اور جنھیں انسانی فطرت ناپاک تصور کرتی ہے: "حلال کے لیے پاک کی قید اس لیے لگائی کہ ناپاک چیزوں کو اس اباحت کی دلیل سے حلال ٹھہرانے کی کوشش نہ کی جائے۔[64] اب رہا یہ سوال کہ اشیاء کے پاک ہونے کا تعین کس طرح ہو گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اصول شرع میں سے کسی اصل کے ماتحت ناپاک قرار پائیں یا جن چیزوں سے ذوق سلیم کراہت کرے یا جنہیں مہذب انسان نے بالعموم اپنے فطری احساس نظافت کے خلاف پایا ہو۔ ان کے ماسوا سب کچھ پاک ہے۔

کیا حلال و حرام کا فیصلہ انسانی فطرت کرتی ہے؟ بحث کا تجزیہ

شریعت اسلامی عین فطرت اسلام ہے جس کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا ہر شخص فطرت اسلام کو نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ وہ پیدا بھی فطرت اسلام پر ہوا ہے۔ جیسا کہ نبی کریمؐ فرمایا: "كل مولود يولد على الفطرة فان ابواه يهودانه او ينصرانه او يمجسانه"[65] ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کو یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ لہذا غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ انسانی فطرت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کیا چیز اس کے لئے طیب ہے اور کیا چیز اس کے لئے خبیث ہے یقینا یہاں تک یہ بات درست ہے کہ انسانی فطرت ہمیشہ طیب اور پاکیزہ چیز کا ہی انتخاب کرتی ہے۔ جبکہ جیسے ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے بعد میں اس کے والدین اس کو یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح

انسان کی فطرت اس کے لئے ہمیشہ طیب اور پاکیزہ چیز کا تقاضا کرتی ہے۔ مگر انسان اپنے خبث باطن جو گناہوں کی بدولت آلودہ ہو چکا ہوتا ہے۔ فطرت کو چھوڑ کر خبیث اور مکروہ اور حرام میں واقع ہو جائے۔ جیسا کہ دنیا کے کئے ایک علاقوں میں آج بھی سور اور خنزیر کو حلال اور پاکیزہ جانتے بھی ہیں اور کھاتے بھی ہیں جو ان کی مرغوب غذائیں ہیں۔ اس اعتبار سے غامدی صاحب کا موقف درست ہے۔ جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے:"کہ انسان ہمیشہ سے یہ جانتا ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہیں، انہیں معلوم ہے کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت نہیں، سواری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ فطرت کو حلت و حرمت کے باب میں مستقل بالذات ماخذ دین قرار دیا جارہا ہے، کسی طرح درست نہیں ہے۔ یہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کے اختیار کا نہیں، بلکہ حلال و حرام کے باب میں شریعت کے بیان کردہ اصول یعنی طیبات اور خبائث کے مصداق کی تعیین کا مسئلہ ہے اور جمہور فقہا نے اس باب میں حلال اور حرام جانوروں کی فہرست تیار کرنے میں نصوص کے علاوہ انسانی فطرت سے بھی پوری رہنمائی لی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ فطری علم کی روشنی میں طیبات وخبائث کی تعیین تحلیل و تحریم کے زمرے میں آتی ہے اور یہ بات انسان کو شارع کے منصب پر فائز کرنے کے مترادف ہے، بدیہی طور پر سوء فہم ہے۔ یہ چیز اگر فطرت کے مستقل ماخذ دین قرار پانے یا انسان کے تحلیل و تحریم کے منصب پر فائز ہونے کو مستلزم ہے تو اس جرم میں متجددانہ رجحانات کے حاملین پوری طرح شریک ہیں۔

خلاصہ بحث

مندرجہ بالا بحث میں ہم نے تہذیب وثقافت سے متعلقہ دو اہم مسائل جن میں متجددانہ رجحانات کے حاملین وناقدین کے دلائل اور ان کا نقد و تجزیہ کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا ہے ان میں سے ایک مسئلہ مسلمان خاتون کا کسی غیر مسلم مرد کے ساتھ نکاح کرنا ہے۔ دین اسلام کی رو سے مسلمان عورت آزاد ہو یا غلام اسے مشرک کے نکاح میں دینا جائز نہیں۔ پھر مشرک خواہ بت پرست، یہودی، عیسائی، مجوسی یا دہریہ کسی بھی غیر مسلم سے مسلم عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ علامہ قرطبی نے اس بات پر امت کا اجماع نقل کیا ہے کہ "مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا متجددانہ رجحانات کے حاملین کا موقف خواتین اسلام کو کسی غیر مسلم سے شادی کرنے کا اختیار دینا کسی صورت درست نہیں۔ یہ سراسر فہم دین سے دوری، محدثین کے اسلوب و منہج سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں ناقدین کے دلائل اس قدر مضبوط ہیں کہ ان کا انکار کسی صورت درست نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں متجددانہ رجحانات کے حاملین کی حیثیت کے بے وقت ہو جاتی ہے۔ لہذا اس مسئلہ میں ناقدین کا موقف ائمہ محدثین کے فہم کے عین مطابق بھی ہے۔ اور اسی طرح دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا حلال و حرام کا فیصلہ انسانی فطرت کرتی ہے؟ شریعت اسلامی عین فطرت اسلام ہے جس کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا ہر شخص فطرت اسلام کو نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ وہ پیدا ابھی فطرت اسلام پر ہوا ہے۔ لہذا غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ انسانی فطرت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کیا چیز اس کے لئے طیب ہے اور کیا چیز اس کے لئے خبیث ہے یقینا یہاں تک تو یہ بات درست ہے لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ فطرت کو حلت و حرمت کے باب میں مستقل بالذات ماخذ دین قرار دیا جانا چاہیے، یہ کسی طرح درست نہیں ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ فطری علم کی روشنی میں طیبات وخبائث کی تعیین تحلیل و تحریم کے زمرے میں آتی ہے اور یہ بات انسان کو شارع کے منصب پر فائز کرنے کے مترادف ہے، بدیہی طور پر سوء فہم ہے۔ اور یہ چیز فطرت کے مستقل ماخذ دین قرار پانے یا انسان کے تحلیل و تحریم کے منصب پر فائز ہونے کو مستلزم ہے۔ اس مسئلہ میں بھی ناقدین کا موقف درست ہے کہ حلال و حرام کا فیصلہ قرآن وسنت کی نصوص سے ہی طے کیا جائے گا نہ کہ فطرت انسانی کو ہی حلت و حرمت میں ماخذ دین قرار دیا جائے گا۔

References

[1]Al-Bukhārī, Muḥammad Bin Ismāʾīl, *Al-Jāmyʾ Al-Ṣaḥīḥ*, (Lāhore: Dār al Salām, 1437 AH), Ḥadith #1378.
[2] Ghulām Aḥmad Pervez, *Ṭaḥirah k Nām Khaṭūṭ* (Lāhore: Zarīn Ārṭ, S.N),157.
[3]Qāsmī, Dr, Muḥammad Dīn, *Tafsīr Maṭalib Al-Furqān k 'Ilmī wa Tehqīqī Jā'izaḥ* (Lāhore: Idāraḥ M'ārif Islāmī, 2009 AH),1:178.
[4] Al. Aḥzāb,33:33.
[5]ʿAsqalani, Ibn Ḥajar, *Fatḥ Al-Bārī*, (Qāhiraḥ: Maktabaḥ Al-Salfīyyaḥ, S.N), 3:189.
[6]Al-Ḥujurāt,49:11.
[7] Sulaīmān ibn Al-Ashʿath, *Sunan Abū Da'ūd* (Beīrūt: Dār al-Risālah al-ʿĀlamiyyah,2009), Ḥadīth #615.
[8] Jāved Aḥmad Ghāmdī, *Khātūn k Nikaḥ parḥana*, Ishraq 7, No. 9 (1996), 61.
[9]Aḥmad ibn Muḥammad ibn Qudāmaḥ, *al-Mughnī* (Qaḥiraḥ: Maktabaḥ al- Qaḥiraḥ, 1968), 2: 432.
[10] Muḥammad ibn Aḥmad ibn Rushad, *Bada'at al-Mujtaḥid* (Qaḥiraḥ: Dār al-Ḥadith, 1425 AH), 1: 325, 326.
[11] Ibn Qudāmaḥ, *al-Mughnī*,2:233.
[12]Aḥmad ibn Hussein Al-Bayhaqī, *Sunan Al-Kubra* (Beīrūt: Dār Al-Kutub Al-'Ilmīyaḥ, 2003), 7: 117.
[13] Muḥammad ibn Ismā'il Ṣanānī, *Subul-al-Salām* (Rīyādh: Maktab Nazār, S.N), 3: 321 .
[14] ʿAsqalani, *Fatḥ Al-Bārī*,2:342.
[15] Abū Bakar ibn Abī Shaybaḥ, *Al-Muṣanaf* (Rīyādh: Maktab al-Rashīd, 1409 AH), 3: 324.
[16]Ḥāfiz Ṣalāhuddīn Yūsuf, *Khawātīn k Imtīyāzī Masā'il* (Lāḥore: Dār al- Salām, 2012), 106.
[17] Ibn Abī Shaybaḥ, *Al-Muṣanaf,* 3:458
[18] Ibn Abī Shaybaḥ, *Al-Muṣanaf,* 3:458
[19]Al-Baqaraḥ, 2: 237.
[20]Jāved Aḥmad Ghāmdī, *Mīzān* (Lāhore: Al-Murid 'Ilm wa Tehqīq, 2014), 211.
[21] Pervez Taḥiraḥ k nām Khuṭūṭ, 198.
[22] 'Umar Aḥmad 'Usmāni, *Fiqh-al-Qurān* (Karāchī: Faẓal & Sanz 2012), 3: 318.
[23] Tāhir Islām Askarī, *Islām par Tashadud pasandī k Athrāt* (Lahore: Darul Fikr, S.N), 116.
[24] Abū Muḥammad 'Alī Ibn Hazam al-Zāhirī, Marātib *al-Ijma'* (Beīrūt: Dār al-'Alam, S.N), 2: 112.
[25] Ibn Hazam, *Marātib al-Ijma',* 2: 114
[26] Maulāna Abū 'Alī Maudūdī, Parda (Lāḥore: Idāraḥ Tajmān Al- Quran,2004), 81.
[27]Al-Aḥzāb, 33:59.
[28] Muḥammad ibn Jarīr al-Ṭabarī, *Tafsīr Ṭabarī* (Beīrūt: Mu'*asisaḥ* Al-Risālaḥ, 2000), 2: 432.
[29] Muḥammad ibn Yūsuf Abū Ḥayyān, *Al-Baḥr Al-Muḥīṭ* (Beīrūt: Dār al-Fikar, 1420 AH), 7: 250.
[30]Abū Ḥayyān, *Al-Baḥr Al-Muḥīṭ*
[31] Aḥmad ibn 'Alī Abū Bakar Al-Jaṣāṣ, Aḥkām Al-Qurān (Beīrūt: Dār Aḥyā Al-Turāth Al-'Arabī, 1405 AH), 3: 372.

[32] Muhammad Ali Ṣābūnī, Rawa'i al-Bayyān (Dimashq: Maktab al-Ghazālī, 1980), 2: 383.
[33]Al-Bukhārī, *Al-Jāmy' Al-Ṣaḥīḥ*, Ḥadith #4140.
[34] *Abū Da'ūd, Sunan Abū Da'ūd,* Ḥadīth #1265.
[35] *Abū Da'ūd, Sunan Abū Da'ūd,* Ḥadīth #1311.
[36] Muḥammad Bin Saad, Al-Ṭabqāt-al-kubra, (Madīna Munwaraḥa: Maktabaḥ-al-'Ulūm, 1408 AH), 1: 137.
[37]*Abū Da'ūd, Sunan Abū Da'ūd,* Ḥadīth #1826.
[38] Dr. Ghulām Jillānī Barq, *Yurap pr Islām k Iḥsān* (Lāḥore: Darul Alam, 2003), 98.
[39] www.urdu.understanding-islam-org.com .
[40] Al-Baqaraḥ, 2: 221.
[41] Al-Baqaraḥ, 2: 221.
[42]Ibn Jarīr, *Tafsīr Ṭabarī,*2:379.
[43] Masū'aḥ Al-Ijma',2:536
[44] Al-Baqaraḥ, 2: 221.
[45] 'Abdul Salām ibn Muḥammad, *Tafsīr Al-Qurān Al-Karīm* (Lāḥore: Dār Al-Undalus, 2018), 1: 181.
[46] Masū'aḥ Al-Ijma',2:865 .
[47] 'Asqalani, *Fatḥ Al-Bārī*,6:523 .
[48] Askarī, *Islām par Tashadud pasandī k Athrāt*, 111.
[49] Masū'aḥ Al-Ijma',2:865
[50]'Asqalani, *Fatḥ Al-Bārī*,2: 865.
[51] 'Asqalani, *Fatḥ Al-Bārī*,6: 522.
[52] Al-Suyūṭī, Al-Durar Al-Manthūr, (Beīrūt: Mu'*asisaḥ* Al-Risālaḥ), 1: 256.
[53] Masū'aḥ Al-Ijma',2:812
[54] Al-Ma'idah,5:5.
[55] Al-Baqaraḥ, 2: 221.
[56] Ghāmdī, *Mezān*,632 -633.
[57]Muftī Muḥammad Shafī, *Ma'arif-al-Qurān* (Karāchī: Idāraḥ Ma'arif-al-Qurān, 2004), 4: 151.
[58]Maulāna Abū 'Alī Maudūdī, *Tafḥīm al-Qurān* (Lāḥore: Idāraḥ Tajmān Al- Quran, 1949), 2: 432.
[59] Maulāna Shabbīr Aḥmad 'Usmāni, *Tafsīr Usmṣnī* (Multān: Idāraḥ Tālīfāt, S.N), 342.
[60] Maulāna Amīn Aḥsan Iṣlāhī, *Tadbur-e-Qurān* (Lāḥore: Maktab-e-Markazī Anjuman-e-Khudām, S.N),1:374.
[61] Hāfiẓ Muḥammad Zubair, *Fikr Ghāmdī* (Lāḥore: Maktab Rahmat-ul-ll'amīn, 2018), 24.
[62] 'Allāma Maḥmūd Alūsī, *Rūh al-Ma'ānī* (Beīrūt: Dār al-Fikar, S.N), 3: 81.
[63] Muftī Muḥammad Shafī, *Ma'arif-al-Qurān,3:321.*
[64] Maudūdī, *Tafḥīm al-Qurān.* 2: 432.
[65]Al-Bukhārī, *Al-Jāmy' Al-Ṣaḥīḥ*, Ḥadith #6599.